

مقالات

اساس دین کی تعمیر

(۲)

از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

(۲) ایمان بالآخرت | اس بنیاد کا دوسرا پتھر ایمان بالآخرت ہے، یعنی ایک ایسے روز جزا کے آنے پر کامل یقین جس میں اعمال انسانی کا خالص اخلاقی نقطہ منجھانہ سے جائزہ لیا جائے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کا دست عدل و حکمت آگے بڑھے گا اور بڑھ کر ہمارے شور و کار کے چہرہ سے اس دارالعمل میں کام کرے: لے قوانین طبیعی کی نقاب کشائی کرے گا۔ جس کے بعد ہر نفس مجبور ہوگا کہ جو کچھ اس نے دنیا میں کیا ہے اس کے اخلاقی نتائج سے دوچار ہو۔

ایمان بالآخرت کی اصل و حقیقت | یہ بات کہ ایک سو یوم جزا آنے والا ہے، قرآن میں جس اہتمام سے بیان ہوئی ہے اس کو دیکھ کر عام ذہن تو یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ بھی ایمان باللہ کی طرح اپنی ایک مستقل اصل اور حیثیت رکھتی ہے، مگر فی الواقع یہ اسی ایمان باللہ کی ایک فرع ہے، یا یوں کہیں کہ اس کا ایک قریب ترین مقصدنا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ ایمان باللہ کے معنی ہیں ذات خداوندی اور صفات باری تعالیٰ کا ٹھیک ٹھیک تصور اور اوجہاں۔ ان صفات میں جو صفات نمایاں ترین ہیں اور جن کے جلوے ہر سمت چھائے نظر آتے ہیں، ان میں عدل و حکمت اور رحمت کی صفات بھی ہیں۔ یہ تینوں صفات چاہتی ہیں اور اپنا پہلا مطالبہ ہی یہی پیش کرتی ہیں، کہ ایک نہ ایک دن جزا و سزا کی میزان آویزاں کی جائے، ورنہ یہ صفات ناقص، اور کمال سے عاری قرار پاتی ہیں، اور ناقص اور کمال سے عاری صفات ذات الہی سے اس وقت تک منسوب نہیں کی جاسکتیں جب تک کہ وہ جوہر امکان کے معنی ایک نہ سمجھ لئے جائیں اور خالق کو مخلوقات کی صف میں نہ لاکھ ڈالیا جائے۔ رہا یہ سوال، کہ یہ صفات ایک سو یوم جزا کے آنے کو کیونکر مستلزم اور متقاضی ہیں، تو یہ اپنے جواب کے لئے غور و بحث کی ایک طویل تفصیل

چاہتا ہے، جس کا یہ موقع نہیں، اس لئے یہاں صرف چند سرسری اشارات پر ہی اکتفا کیا جائے گا:-

اقتضائے عدل | عدل کے معنی ہیں گانے کی تول حق رسانی، یعنی جو شخص جس حق اور جس برتاؤ کا مستحق ہو وہ ٹھیک ٹھیک اس کے سامنے رکھ دیا جائے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ عادل ہے تو اس کا مجروح عادل ہونا ہی تقاضا کرتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ملے۔ اس لئے جو اخلاقی حدود مقرر کئے ہیں ان کی پابندی کرنے والے کو اپنی خوشنودیوں اور نعمتوں سے شاد کام کرے اور جو ان حدود کا پاس نہ کرے اس کو قرار واقعی سزا دے۔ عدل و انصاف کا یہ وہ بنیادی اصول ہے جس سے آج تک اختلاف ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ دنیا میں کسی نے بھی دوست اور دشمن، فوج اور اعدا، فرمان، اطاعت کیش اور باغی دونوں کو ایک برتاؤ کا اہل نہیں سمجھا ہے، تو یہ گمان کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ ذات، بوسرا یا عدل و انصاف ہے، وہ اپنے وفاداروں اور باغیوں میں تمیز نہ کرے گی! چنانچہ اس نے خود ان لوگوں سے جو اپنی بدکرداریوں اور نافرمانیوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور اپنے اعمال بد کے انجام سے بے فکر تھے، حیرت بھرے انداز میں پوچھا اور بار بار پوچھتا رہا کہ تاوانو! جب یہ ایک حقیقت ہے کہ اندھا آنکھوں والے کے تاریکی روشنی کے، سایہ و صوب کے اور مردہ زندہ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ (مَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَدُودُ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ)۔ اور تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے تو پھر تمہارے دماغ میں، بقائمی ہوش و حواس، اتنی بڑی بے عقلی کی بات کیونکر سما جاتی ہے کہ ہم مسلم اور مجرم دونوں کو ایک سطح پر رکھیں گے؟ (أَفَجَعَلَ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ؟)۔

غرض نیکو کاروں کو اچھا اور بدکاروں کو برا بدلہ ملنا، اور ان کے اعمال کے عین مطابق ملنا عدل خداوندی کا سب سے پہلا اور لازمی تقاضا ہے۔ مگر اس دنیا میں عملاً ہو کیا رہا ہے؟ کیا ایسا نہیں کہ یہاں کی خوش حالیاں، یہاں کی زمینیں، یہاں کی نعمتیں یہاں کی سر بلندیاں بالعموم ان کو نہیں ملتیں جو اہل حق ہیں، بلکہ اُلٹی ان کے حصے میں آتی ہیں جو حق کے دشمن اور احکام الہی کی دھجیاں اڑانے والے ہیں؟ اسی طرح کیا وہ جو ان احکام کی پیروی کرتے ہیں ان کے گرد و پیش بد حالیاں، گنہامیاں، فلاحیتیں مظلومیتیں نہیں چھانی رہتی ہیں؟ کیا یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ بدی، ظلم، کیاوی اور بے ایمانی کی راہ دولت و عزت کے عشرت کردوں میں لے جاتی ہے اور نیک رومی، صن خلق، حق شناسی

اور خدا پرستی کا راستہ ان نار زاروں میں پہنچا دیا کرتا ہے جہاں دل شکنیوں، مشکلوں اور مصیبتوں کے کانٹے انسان کے جسم و روح کو چھلنی بنا دیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہاں یہی سب کچھ مجبوراً ہے اور ہماری آنکھیں نت اسی حقیقت کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں۔ تو اگر کوئی دوسرا عالم نہ پرا ہو اور کوئی ایسا دن نہ آئے جس میں اس صورت حال کو پلٹ دیا جائے اور ہر شخص کا حساب اس کے اعمال کے صحیح استحقاق کے مطابق چکا دیا جائے تو خدا کا وہ عدل کہاں رہا جو اس کی بدیہی صفات کمال میں سے ہے! اس لیے اگر خدا عادل ہے تو ایک یوم الحساب کا آنا اس کے عدل کا ویسا ہی لازمہ ہے جیسا کہ عدل اس کی خدائی کا۔

اقتضائے حکمت اب صفت حکمت کو لیجئے۔ حکیم کہتے ہیں اس کو ہیں جس کا کوئی فعل حکمت اور مقصدیت سے خالی نہ ہو۔ جو جتنا بڑا حکیم ہوگا۔ اس کے افعال اتنے ہی زیادہ ہا مقصد اور پُر از حکمت ہوں گے۔ یہ ایک عام مسئلہ ہے اور علم و منطق کے ابتدائی بدیہیات میں سے ہے۔ اس بدیہی حقیقت کی روشنی میں اس حکیم و دانائے مطلق کے افعال و شئون پر نگاہ ڈالنے جو سراپا حکمت اور منبع حکمت ہے۔ یہ کارگاہ عالم، جو آپ کی نگاہوں کے سامنے اور آپ کی حدود نظر میں ہے، اسی حکیم کے کارناموں کا ایک باب ہے۔ اس پر غور کیجئے اور دیکھیے کہ یہ عظیم الشان کائنات، جس کے تمام اجزا منظم طور پر سنی و حرکت میں لگے ہوئے ہیں، جس کے مختلف حصوں میں کامل توافق اور ہم آہنگی نظر آرہی ہے، جس کا ایک ایک ورق عدل و معلول کے ناقابل شکست شیرازہ میں بندھا ہوا ہے، کیا یہ کائنات اپنی تخلیق کے پیچھے کوئی غایت نہیں رکھتی؟ جس کائنات کا ہر جزو اپنی جگہ نہایت کھلے ہوئے مقاصد کا حامل ہے، کیا وہ بحیثیت مجموعی اپنا کوئی ایک مقصد بھی نہیں رکھتی؟ یعنی کل کا ہر جزو تو بچائے خود ہا مقصد ہو، مگر کل بحیثیت کل بے مقصد ہو! عقل سلیم اسے کیسے مان سکتی ہے؟ اور پھر یہ انسان جس کو عقل و فکر کی بے نظیر صلاحیتیں اور سعی و عمل کی حدود نا آشنا قابلیتیں دے کر بھیجا گیا ہے، کیا اس کی آفرینش مقصدیت سے تہی دامن ہو سکتی ہے؟ جس انسان کی چاکری میں زمین کے ذروں سے لے کر آسمان کے آفتاب و مابتاب تک لگے ہوئے ہوں وہ خود کسی غایت و مقصد کی غلامی سے آزاد ہے؟ خالق کائنات کو حکیم ماننے والا اس سوال کا جواب اثبات میں کیسے دے سکتا ہے۔ اس کی بسیرت کی نگاہیں تو خوب ان حقائق کو دیکھیں گی تو اس کا دل بے اختیار پکار اٹھے گا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا مُّبِينًا إِنَّكَ فَقَّاعْدَابِ النَّارِ اور وہ جب بھی خدا کی صفت حکمت کا تصور کرے گا اس کی زبان و زبان الہی سے ہم نوا ہو کر

باز از استجواب دنیا سے سوال کرے گی کہ :

أَجَسْتَبِ الْإِنْسَانُ أَنْ يَشْرَكَ مَشِي (قیامہ ۲)

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے جو بھی چھوڑ دیا جائے گا

اور یہ کہ :-

أَفَحَسِبْتُمْ أَنْمَّا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنْتُمْ عَلَيْنَا

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم بلا کسی مقصد کے پیدا کیے گئے

لَا تَرْجِعُونَ - (مومنون - ۶)

ہو اور تمہیں اپنے خالق کے دروہ و لوٹ کر جانا نہیں ہے ؟

اقتضائے رحمت | ارہی صفت رحمت، تو اس کا بھی تقاضا یہی ہے کہ ایک یوم مکافات برپا ہو، تاکہ ان بندگان

حق کی سب دجہد کا جو دنیا میں محض خدا کی خاطر مصائب و آلام کا شکار ہوئے خالق کی طرف سے اعتراف کیا جائے

اور انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اپنی آغوش شفقت میں لے کر اس طرح ان پر سے رنج و غم کے غبار کو جھاڑ دے جس

طرح ایک مل اپنے فغان و اندوہ بچے کی بائیں لے کر اس کو دلشاد کرتی ہے جب کہ وہ اس کے حکم کے بموجب

کئی کشتی جہم میں اپنے پسینے بہا کر واپس آیا ہو۔ ورنہ خدا کا رحیم ہونا تو درکنار، اس کو بے مروتی اور سنگ دلی سے بری

ثابت کرنا بھی ممکن نہ رہے گا۔ تعالیٰ العزہ۔ پس اس کی رحمت گواہ ہے اس بات پر کہ ایک یوم بڑا آ کر رہے گا۔

اور یہ وہ حقیقت ہے جو خود قرآن کے اشارات میں واضح طور پر موجود ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ :-

كُتِبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةُ لِيَجْمَعَ كُودِي

اس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے (اس لئے) وہ قیامت

يَوْمَ الْيَقِينَةِ تَرَى كُودِي -

کے دن تم سب کو ضرور جمع کرے گا جس کے آئے میں کوئی

(احقاف - ۲)

شک نہیں۔

ایمان بالآخرت کی اہمیت | اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ایمان بالآخرت کی اصل و حقیقت کا تعلق ہے وہ

فی الواقع ایمان باللہ ہی کی فرع ہے اور اس لئے اس کے مقابلہ میں اس کی حیثیت ثانوی ہے، جیسا کہ اوپر کی

تفصیل سے آشکارا ہو چکا، مگر دین حق کی اطاعت و اقامت کے زاویہ نظر سے، اور انسانی زندگی پر اپنے اثرات کے

محاکات سے یہ اس کے مقابلہ میں کسی طرح بھی کم اہمیت کا مالک نہیں، بلکہ بعض اعتبارات سے تو اس سے بھی بڑھ کر ہے

انسان کی حیوانی حیثیت میں جو عجلت پسندی، عاجلہ پرستی و ولایت کی گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی

بھی باور نہیں کیا جاسکتا کہ اگر انسان کو اپنے اعمال کی باز پرس کا اندیشہ نہ ہو تو وہ نیکی و حق پرستی کی سنگلاخ وادی

قطع کرنے پر تیار ہوگا۔ اس کو خدا کی ذات اور اس کی یکتائی کا لاکھ یقین بھی، مگر جب اسے یہ معلوم ہو کہ میرے ہر عمل کا آخری اور قطعی انجام وہی ہے جو اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اور موت کا پردہ گرتے ہی زندگی اور اس کی تمام حرکات کا تماشا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانے والا ہے، تو زنادان ہی ہوگا اگر اس نے ”بعیش کوش“ کے فتوے پر عمل نہ کیا، اور دنیا اس کی ہر قسمی کامیابی کرے گی اگر اس نے جی کھول کر واد نفسانیت نہ دی۔ بخلاف اس کے اگر اس کو قیامت کے آنے اور اعمال کا حساب کتاب لیے جانے کا پورا یقین ہو تو بہر حال اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو کسی نہ کسی اخلاقی ضابطہ کا پابند رکھے گا، نہ صرف وحدانیت کا قائل ہونے ہی کی صورت میں،

لے بعض صوفیہ کا یہ کہنا کہ جس سے قیامت کے اندیشے اور عذاب دوزخ کے خوف اور جنت کے لالچ سے حق پرستی اور طاعت و بندگی کی راہ اختیار کی، اس نے فی الحقیقت شرک کیا۔ مومن کی شان یہ ہے کہ جنت دوزخ سے بے نیاز ہو کر خدا کی والہانہ بندگی محض اس بنا پر کرے کہ وہی تمام صفات جمال و کمال کا جامع اور وہی صنم ہے، نہ کہ کسی خوف اور لالچ کی بنا پر۔ یہ دراصل عالم جذب اور جوش محبت میں تھکے ہوئے الفاظ ہیں جن میں حقیقت سے زیادہ شاعرانہ غلو کا فرما ہے۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ طرف توجہ اور انابت کی کثرت کسی خاص مقام پر پہنچ کر روح انسانی میں ایسی وابستگی اور انجذاب کی کیفیت پیدا کر دے کہ اس کے اساسات پر سے اندیشہ جزا و جزا کے نقوش قریباً ناپید ہو جائیں اور صرف محبت ہی محبت کے جذبات چھائے ہوئے رہ جائیں، مگر یہ امکان کبھی بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اول روز ہی سے یہ کیفیت حاصل ہو سکتی ہے اور انسان آخرت کے کشے کو اپنے دل میں جکد دیتے بغیر ہی اس راہ دشوار پر قدم رکھ سکتا ہے، بلکہ ضروری ہے کہ خدا پرستی کے آغاز میں خوف آخرت ایک اہم عنصر بلکہ شاید اصل محرک کی حیثیت رکھتا ہو۔ اس محرک کے بغیر نفس انسانی بندگی کی قیود برداشت کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں آگے چل کر جب محبت کے جذبات تیز تر ہو جائیں، اس سے بے نیازی برت سکتا ہے، اگرچہ یہ بے نیازی بھی خطرات سے خالی نہیں اور واقعات بتاتے ہیں کہ کتنے ہی ارباب سلوک اسی ترنگ میں اپنے آپ کو تباہ کر بیٹھے۔ اسی لئے مومن کی صفت شریعت کے مزاج شناسوں نے یہ بیان کی ہے کہ ”مومن وہ ہے جو خدا کی بندگی بیک وقت خوف اور رجا اور محبت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرے۔ اسی نقطہ سے آغاز بھی کرے اور اسی پر اس کا انجام بھی ہو“ چنانچہ قرآن مجید نے جہاں سچے مومنوں اور رحمت الہی کے اہل ترین بندوں کی خصوصیت بتائی ہے کہ ان کی محبت کا اصل مرکز ذات الہی ہے (وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ)، وہاں ان کے متعلق یہ بھی کہا ہے — پورے مدح سرایانہ انداز میں کہا ہے اور ان کے کمال بندگی پر اپنی مہرِ رضا ثبت کرتے ہوئے کہا ہے: (باقی صفحہ ۱۶۶ پر دیکھیے)

بلکہ — اگر ایسا عملاً ممکن ہو — مشرک ہوتے ہوئے بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مشرکانہ عقاید خدا کے ہاں اس کے اعمال کو میزان محاسبہ میں بے وزن بنادیں۔ لیکن جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ایک مشرک کا ایک منکر قیامت کے مقابلہ میں کسی ضابطہ اخلاق کا پابند ہونا اور ہوائے نفس کے ہاتھوں میں بالکل اپنی زمام کار سوئپ دینے سے مجتنب رہنا بہر حال زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس لیے ایمان بالآخرت کو ایمان باللہ کے برابر یا بعض اعتبارات سے اس سے بڑھ کر اہمیت دینا خلاف واقعہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جس شد و دہ اور جس تفصیل و تصریف کے ساتھ توحید پر دلائل دیے ہیں، معاد کے وقوع پر آفاق و انفس کی محکم اور دل نشیں شہادتیں، ہم پہنچانے میں اس کے کم زور نہیں صرف کیا ہے۔ قرآن پر نگاہ ڈالئے تو صفحے کے صفحے، اور کی سورتوں میں تو قریب قریب پوری پوری سورتیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵)

اور وہ لوگ، جو راہ خدا میں جو کچھ دیتے ہیں اس حل میں دیتے ہیں کہ ان کے دل اس اندیشے سے کانپ رہے ہوتے ہیں

وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا اتَّوُوا وَقَلُّوا بِهِمْ
وَجِلَّةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ۔

کہ انہیں اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

(المومن - ۴)

(یہ ابراہ اور "عباد اللہ" وہ ہیں جو) اپنی نذر دے دیں (یعنی واجباً دینی)

يُؤْتُونَ بِالْغَدْرِ وَخَافُونَ يَوْمًا

کو پورا کرتے ہیں اور اس بڑے دن سے ڈرتے ہیں جس کی ہولناکی

كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا رَاثًا

عام اور ہمہ گیر ہوگی (وہ کہتے ہیں کہ) ہم اپنے رب کی طرف سے

خَافَ مِنْ رَبِّكَ يَوْمَ عَابَتُو سَأَقْمِطُ يَدًا

ایک سخت اور تلخ دن کا خوف کھاتے ہیں (اور اسی لئے یہ اعمال

(الدھر - ۱)

کرتے ہیں)

اس قسم کی آیات قرآن میں ایک دو نہیں، بے شمار ملیں گی۔ ان آیات میں معمولی اہل ایمان کی صفات نہیں بیان کی گئی ہیں بلکہ

ان میں ان اباب ایمان کے ایمان کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو معیاری مومن ہیں، جن کو "الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا" کہا گیا ہے، جن کو

الابرار کے خطاب سے نوازا گیا ہے، جن کو "عباد اللہ" اور "عباد الرحمن" کی سند محبوبیت مرحمت فرمائی گئی ہے۔ ان آیات میں

کامل المعیار ایمان کا یہ نقشہ دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ آخرت پر ایمان اور ایم الحساب کا خوف اس نقشہ میں اپنا نشان کتنا نمایاں رکھتا ہے

اس کو دیکھ کر کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ نیکی و تقویٰ اور سچی بندگی کا حق ادا کرنے میں (باقی صفحہ ۱۶۷ پر دیکھو)

قیامت کے پڑھول اور دہشت ناک کوائف کے ذکر، اور اس کے وقوع کے امکان، اور اس کی ضرورت کے دلائل سے بھرپور نظر آئیں گی، جو شہادت ہے اس امر کی کہ قرآن کے نزدیک عقیدہ آخرت کا دلوں میں اذعان پیدا کرنا توحید کے بعد تمام حقائق دینی سے اہم تر اور مطلوب تر ہے۔ جس قرآن کے اعجاز و بذاغت کی قمیں کھائی جاتی ہیں اس کا کسی امر کے ساتھ یہ اعتناء کہ اپنے الفاظ کا ایک معتد بہ حصہ وہ اسی کے اثبات و استشہاد اور اسی کی تلقین و تصریف بیان کی نذر کر ڈالے، اس بات کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اس کی نگاہ میں اس ایک امر کی دوسرے حقائق دینی پر وہی فوقیت ہے جو فوقیت آنتاب کو اپنے گرد گھومنے والے کروں پر حاصل ہے۔ جس طرح آفتاب کا مرکز کشش ان تمام اجرام فلکی کے قیام و بقاء اور اس کا سرچشمہ نور ان سب کی تابانیوں کا ضامن ہے اسی طرح یہ عقیدہ آخرت (عقیدہ توحید سے ہم دست ہو کر) ساری نیکو کاریوں کا کفیل ہے۔ اگر اس عقیدہ کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوتی تو وہ قرآن، جس نے نماز جیسی عبادت کا صرف حکم دینے پر اکتفا کر لیا اور اس کے احکام، اس کے طریق ادا اور اس کی رکعات اور ارکان وغیرہ کی تفصیلات بیان کرنے پر چند کلمات کہنا اور چند لمحے دینا بھی غیر ضروری سمجھا، وہ اس کے بیان کے سلسلے میں الفاظ اور اوقات کے اس بے دریغ خرچ سے ہرگز کام نہ لیتا جس کا مشاہدہ قرآن کے صفحات میں ہم کر رہے ہیں۔

ایمان بالآخرت کی یہی اہمیت ہے جس کے باعث اس کو ایمان بالمد کا ایک جزو اور فرع ہونے کے باوجود اس دین کی تعمیر میں ایک مستقل سنگ بنیاد کی حیثیت دی گئی ہے، جب کہ دوسرے تمام ایمانیات کو اس مقام کا مستحق نہ سمجھا گیا۔ کیونکہ یہی دو ایمانیات ایسے ہیں جن کے صحیح تحقق پر انسانی زندگی کے سنورنے اور منشاء الہی کے مطابق بسر ہونے کا انحصار ہے۔ یہ دراصل دو پہیے ہیں جو اعمال انسانی کی گاڑی کو بندگی اور اطاعت حق کی شاہراہ پر چلاتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک پہیہ بھی غائب یا بیکار ہو جائے تو یہ گاڑی کبھی بھی اس راستہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۶) قیامت کا یقین ایک مرکزی حیثیت اور ضروری شرط کا درجہ نہیں رکھتا ہے! حدیث ہے کہ اس مقرب ترین اور محبوب ترین بندے کی زبان سے بھی، جس کا تقرب ناقابل تصور اور جس کی محبت اور محبوبیت ماورائے تمنا ہے، اطاعت حق پر جے رہنے اور نافرمانی رب سے مجتنب رہنے کی وجہ یہ ظاہر کرائی جا رہی ہے کہ ”ایک یوم عظیم کی سزا کا خوف ہے، قُلْ اِنِّیْ اَخَافُ اِنْ عَصِیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ“ پھر تابعدار چلے۔ (ص ۱۰)

پر نہیں چل سکتی۔ ایسی صورت میں یہ گاڑی شیطان کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے جو اس کو اس شاہراہ حق سے ہٹا کر شروطنیان کی سنگلاخ وادیوں میں گھسیٹتا پھرتا اور انجام کار ہلاکت کے گہرے کھدے میں ڈال دیتا ہے۔ سچی ہدایت اور سچی اطاعت کے لئے ان دونوں عقائد کی۔ ہی یکسانی۔ اور باعتبار حصول مقصد ایک کی دوسرے کی طرف ہی شدت اختیار ہے جس کے سبب قرآن حکیم نے دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کرنے کا اسلوب بیان پورے اہتمام کے ساتھ اختیار کیا ہے اور جہاں کہیں بھی اس نے توحید کی تعلیم و ہدایت اور اس کے دلائل سے گفتگو کی ہے، وہاں بالعموم قیامت کے ذکر و اثبات سے ضرور تعرض کیا ہے۔ اور اسی طرح اس کے برعکس بھی۔ اس اہتمام کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کو اس کی مرغوبات نفس سے روک کر اطاعت الہی اور نیکی و تقویٰ کے تلخ نوالوں کو حلق سے نیچے اتارنے پر آمادہ کرنا نہ تو تنہا عقیدہ توحید کے بس میں ہے اور نہ ہی عقیدہ آخرت کے امکان میں۔ تنہا تو میرا اس سے مطالبہ کرے گی کہ خدا کا حق پہچانے اور اس کے احکام کی پابندی کرو، وہ جواب دے گا جب مجھے مرنے کے بعد نسیا نسیا ہو جانا ہے اور خدا کے سامنے نہ حاضری دینی ہے اور نہ ہی اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے تو خواہ مخواہ طاعت و بندگی کا یہ بار گراں اپنی گردن پر کیوں لٹا دے پھروں؟ اسی طرح اگر قیام قیامت کا یقین اس سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کے فلاں فلاں حدود کی پابندی کرو، وہ فوراً جواب دے گا کہ نیچے مجھے پیدا کیا ہے، وہی مجھے فنا کرے گا اور وہی اس پوری کائنات کو بھی ایک روز تباہ کر کے رکھ دے گا، یہ بیچ میں ”اللہ تعالیٰ“ کون سی چیز ہے جس کے کچھ حدود بھی ہیں، جن کی مجھے پابندی کرنی ہے؟ یا اگر وہ وجود الہی کو مانتا ہو گا مگر ساتھ ہی توحید کا قائل نہ ہو گا تو یوں کہے گا کہ ”خدا کا خالق کائنات ہونا برحق، اس کا رب ساری اعلیٰ ہونا بھی بجا، اور قیامت کا آنا بھی یقینی، مگر یہ ارواح عظیمہ، یہ انبیاء و ملائکہ، یہ اقطاب و بزرگان دین بن کی ہم ندریں پڑھاتے ہیں، جن کے مھالوں اور مزاروں پر ہم سالانہ یا ماہانہ یا ہفتہ وار سجدے کر لیا کرتے ہیں اور جن کو خوش رکھنے کے لئے ہم کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ یہ سب قیامت میں اعمال کی ترازو اٹھنے کب دیں گے اور ہمارے سب کتاب و دفتر کھلنے کیوں پائے گا۔ ان کی ایک سفارش ہماری بخشش کے لئے کافی ہوگی۔ اس لئے خدا کے احکام اور حدود کی بکشت سے ہمیں کیا بکشت!“

ایمان بالآخرت اور تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کسی قوم میں اخلاقی بگاڑ اور مادہ پرستانہ طرز عمل رونما ہوا ہے اسی دنیا پرستی میں تضاد وقت ہوا ہے جب کہ اس کے اندر سے توحید کا تصور اور آخرت کا خوف رخصت ہو چکا تھا۔

یا اگر تھا بھی تو اتنا دھندھلا اور اس قدر بے جان کہ اس کے معاملات زندگی پر اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد اس کی تمام تر توجہات کا مرکز یہی دنیا بن گئی اور دوسرے عالم کے تصور کو اس کی تسلاً آواز نہ تھی کہ وہ اس کے دماغ کو پریشان کرے۔ اور اگر کبھی "سوے اتفاق" سے یہ تصور سامنے آتا بھی تو اس کو یہ جواب دے کر رخصت کر دیا جاتا کہ یہ امت مرحومہ کا حلقہ ہے، اس کے اندر داخل ہو جانا ہی حسن عاقبت کی گارنٹی ہے:

قَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا - انہوں نے کہا یہودی ہو جاؤ، یا نصرانی ہو جاؤ، پس تم ہدایت پائے

اس فریب نفس کا نشہ نزول قرآن کے وقت لوگوں پر بری طرح چھایا ہوا تھا، اور واقعات گواہ ہیں کہ آج اس نشہ کی مستی کچھ بڑھ ہی گئی ہے، کم نہیں ہوئی ہے، حتیٰ کہ اگر اعتراف حقیقت کی ہم میں جرأت ہو تو اس مستی کا خمار ہم خود اپنی آنکھوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی علت اس کے سوا کچھ نہیں کہ دلوں سے توحید و مباد کا صحیح تصور غائب ہے اور وہ خوش آئند تمناؤں (امانی) میں غرق ہیں۔ قرآن مجید نے ان سب کو یہ حقیقت سنا دی ہے کہ نجات کا انحصار نہ تو گروہ مسلمین میں داخل ہونے پر ہے، نہ گروہ یہودی میں، نہ گروہ نصرانی میں اور نہ ہی کسی اور گروہ میں۔ مدار نجات ہے توحید اور یوم آخرت کا سچا اور زندہ ایمان اور وہ حسن عمل، جو اس ایمان کی تہوں سے خود بخود ابھرتا ہے۔ (إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ) (البقرہ) یہ آیت جہاں ایک طرف اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہی طاعت و بندگی کے اعتقادی اساسات ہیں، وہاں دوسری طرف امت محمدیہ پر اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کی ایک مجسم یادگار بھی ہے کہ کس طرح اس نے اس امت کے لئے پہلے ہی سے وہ منفذ بند کر دیا تھا جس سے پچھلی امتوں پر ضلالت، ہوا پرستی، نا خدا ترسی، شریعت الہی سے بے توجہی، احکام دین سے سربازی اور فساد انجام سے بے نیازی کے فتنے ٹوٹ پڑے تھے، اور باوجود اس کے کہ اس وقت مسلمانوں کے دلوں میں اس گمراہی و ہم کا کوئی ہلکے سے ہلکا بھی پر تو نہیں پڑا تھا مگر چونکہ آئندہ اس کا خطرہ تھا اس لئے بطور حفظ و اتقدمات انہیں بھی تنبیہ کر دی کہ جس طرح مدار نجات یہودیت یا نصاریت یا صابیت نہیں ہے اسی طرح "مسلمانیت" بھی نہیں ہے۔ پس کسی گروہ یا امت میں داخل ہو جانے ہی کو پروانہ نجات سمجھنے کی جس غلطی نے آج ان یہود و نصاری کو ڈبو رکھا ہے، کہیں وہی غلطی کل تمہیں بھی نہ ڈبو دے۔ مگر واٹے بد قسمتی کہ ہم نے اس تنبیہ سے بہت کم فائدہ حاصل کیا اور اپنے کارخانہ منطق و

دکلام کی ڈھیلی ہوئی گولیوں سے اس بند کو چپنی کر ڈالنے کی کوششوں سے باز نہ رہے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امت بھی اندیشہ و سہم سے بے نیازی کے نکتوں سے محفوظ نہ رہ سکی اور انجام کار آج اس کے اندر ایمان بالمد اور ایمان بالآخرت دونوں کی جڑیں ہل چکی ہیں۔ اور جب ایسا ہو چکا تو تعجب نہ کرنا چاہیے اگر اس سے تقویٰ کی روح رخصت ہو چکی ہو، اگر اسے اپنا مقصد جیتا فراموش ہو چکا ہو، اگر اس کے دماغ سے حق کے شے جیسے اور حق ہی کے لئے مرنے کا سودا اکل چکا ہو۔

اس صورت حال پر ہم جتنا ہی زیادہ غور کرتے ہیں، اتنا ہی زیادہ ہمیں یقین ہوتا جاتا ہے کہ ہمارے اندر گویہ دونوں ہی بنیادی ایمانیات متزلزل ہو چک ہیں مگر ایمان بالآخرت پر ہماری غفلتوں نے زیادہ توجہ کی ہے۔ ایمان بالمد کا وجود ابھی اس حد تک ناپید نہیں، جس قدر کہ ایمان بالآخرت کا۔ بحیثیت مجموعی اگر امت کے ایمان بالمد کی روح کو نشہ اور مضلل کہا جائے تو اس کے ایمان بالآخرت کی روح کو بے حس اور مغلوب کہنا چاہیے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ پچھلی تمام امتوں میں بھی یہی کچھ صورت حالات دکھائی دے رہی ہے۔ ہم قرآن میں جس قوم کا تذکرہ بھی پڑھتے ہیں اس کو خدا کا انکار کرتے ہوئے تو نہیں پاتے مگر قیامت کے معاملہ میں قریب قریب ہر قوم کی طرف سے اسی نوع کی حیرت کا اظہار دیکھتے ہیں کہ :

عَرَأَيْنَا لَمَرَّ دُودُونٍ فِي الْحَافِرَةِ إِذَا كُنَّا عِظَامًا حَنِينَةً - (نازعات - ۱)

کیا ہم (مرنے کے بعد زندگی کی) پہلی حالت میں پھر لوٹائے جائیں گے؟
کیا یہ اُس وقت (ہوگا)، جب کہ ہم گلی سڑی ہڈیاں ہو جائیں گے؟

اور اگر بعض اقوام ایسی نکلیں بھی کہ انہوں نے قیامت کا اس جزم کے ساتھ انکار نہیں کیا تو ان کا قیامت کا ماننا بھی اس انداز کا تھا کہ عمل اور نتیجہ کے اعتبار سے وہ نہ ماننے ہی کے مرادف تھا۔ اب جب یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے دل و دماغ میں ایمان بالمد اور ایمان بالآخرت دونوں کی جڑیں جمانے کی ابتدا ہی سے کوشش کی اور آخر دم تک ان جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہا، کیونکہ یہی دونوں ایمانیات دین حق کے سنگِ بانی ہیں تو آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ پیغمبر کے جانے کے بعد جب اس کے پیروں میں گمراہی نے اپنا سر نکالا تو اس کا اولین ہدف ایمان بالآخرت ہی بنا؟ ایمان بالمد کا تو کلی استیصال اس نے کبھی نہیں کیا مگر ایمان بالآخرت کے بارے میں اس نے اس وقت تک اطمینان کا سانس نہیں لیا جب تک کہ لوگوں کے دماغ کے ایک ایک ریشے سے اس کے امکان کے تصور کو جڑ بنیاد سے کھود کر بھینک نہ دیا؟ خدا کے بارے میں تو وہ اس بات پر اگر بالکل راضی ہو گئی کہ اسے خالق کا

اور رب اعلیٰ مانا جائے، ہاں صرف شرط یہ تھی کہ اس کے نیچے بھی چھوٹی چھوٹی خدائیوں کے کچھ عہدے تسلیم کر لئے جائیں، مگر قیامت کے متعلق اس نے کسی قسم کی رواداری نہیں دکھائی اور اس کے لیے ذہن انسانی میں کسی امکان کا وہم بھی باقی رہنا اس نے گوارا نہیں کیا۔ اس کی وجہ کا سراغ لگانے والا اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں پاسکتا کہ نفس انسانی پر شرائع الہیہ کی پابندیاں ہمیشہ گراں گذرتی ہیں اس لئے وہ ہر آن ان سے راہ فرار اختیار کرنے کی سعی کرتا ہے اس سعی میں قیامت کا تصور سب سے بھاری رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ اپنے تمام شیطانی حربوں اور تدبیروں کو اس رکاوٹ کے ہٹا پھینکنے میں صرف کر دیتا ہے، اور پھر دم اس وقت لیتا ہے جب اس رکاوٹ کو اپنے راستے سے بالکل ہی ہٹا دے، یا اگر کچھ رعایت کرتا بھی ہے تو بس اسی حد تک جس حد تک کہ آج کل انگریزی حکومت نے ”دین اسلام“ کو اپنے وجود کے اظہار کی رعایت دے رکھی ہے۔ جس ایمان بالآخرت کا رشتہ انسانی زندگی کے رویہ سے یکسر کٹا ہوا ہو اس کو ایمان کہنا ایمان کی توہین نہیں تو اور کیا ہے نفس امارہ نے اپنی اس سنت کا اعادہ امت محمدیہ کے اندر بھی بعینہ اسی طریقہ سے کیا ہے جس طرح پچھلی امتوں میں کرتی رہی ہے۔ خدا کے وجود سے انکار تو خال خال ہی نظر آتا ہے اور توحید کے اقرار سے بھی قلوب ایک بڑی حد تک معصوم ہیں، مگر ایک روز جزا کے آنے کے یقین، محاسبہ اعمال کے اندیشے اور آخرت کی باز پرس کے خوف سے دلوں کی بستیاں اس طرح ابلڑ گئی ہیں جس طرح کسی زبردست بھونچال کے بعد انسانی آبادیاں ابلڑ جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زبان سے قیامت کا انکار کرنے والے مسلمان آپ کو شاید ہی ملیں گے، مگر اس عدم انکار کے پیچھے خوف آخرت کے وہ کون سے عملی شواہد ہیں جن کی بنا پر آپ اس ”اقرار کو ایمان“ کہہ سکیں؟ اگر کوئی اھوڈا اذ فصادی ٹھٹھڑا کے گمان باطل نے چشم بصیرت پر تحجب کی پٹی نہیں باندھ دی ہے تو آپ کو اعتداف کرنا چاہیے کہ آج ہم ایمان بالآخرت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود وہی سب کچھ کر رہے ہیں جو ایک خوف جواد سزا سے بے پروا انسان کیا کرتا ہے۔ ایک دیدہ بینا دنیا پرستی، مصلحت کوشی، افادیت پسندی اور حدود شریعت سے گریز پائی کے اس خوفناک سیلاب کا کیونکر انکار کر سکتی ہے جو دلوں پر چھاتا چلا جا رہا ہے اور جس کے انداز ایمان بالآخرت ایک تنگ کی طرح بہتا نظر آ رہا ہے؟

یہود کی مثال | یہ حقیقت، کہ خدا کے نزدیک وہی ایمان بالآخرت معتبر ہے جو اپنی پشت پر حسن عمل اور پابندی شریع

کی مضبوط شہادتیں رکھتا ہو، قرآن مجید کی مرتب کردہ اُس فرد قرار وادبم کے اندر پوری طرح نمایاں ہے جو اس نے یہودیوں کے خلاف عاید کی ہے۔ قوم یہود وہ قوم ہے جو قیامت کو زبانی طور پر ماننے اور عملی طور پر نہ ماننے کی کیفیت کی ایک تصویر ہے۔ ان یہودیوں کا کہنا تو یہ تھا کہ ایک روز جزا آنے والا ہے، اس کہنے کا تقاضا یہ تھا کہ اس دن کے لیے تیاری کرتے اور خدائی بارگاہ میں حاضر ہونے کے خیال سے اندیشہ ناک رہتے اور اس کے لیے احکام الہی کی پیروی میں ہمیشہ از ہمیشہ سرگرمی سے کام لیتے، مگر ان کی رگوں میں جو نفس پرستی اور دنیا طلبی رچ بس گئی تھی، وہ اس تقاضے کو پورا کیسے ہوئے دیتی۔ اس لیے انہوں نے خدا اور اس کی شریعت کو فریب دینے کی تدبیریں کیں اور اب ایک روز جزا آنے کا عقیدہ اس طرح کی ایک ”سیاسی تصویر“ بن گیا:۔

(ا) ہم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ بقرہ ۱)۔ (نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا۔ بقرہ)۔

(ب) لیکن ہم اس کے بیٹے اور پوتے ہیں (كُنْ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّاءُ۔ مائدہ ۱۸)۔

(ج) اس سے خواہ ہم کتنی ہی نافرمانی کریں وہ ہمیں ضرور بخش دے گا (سَيُخَفِّرُ لَنَا۔ اعراف ۴۱) یا اگر کچھ بڑا دی بھی تو وہ گنتی کے دنوں سے زیادہ نہ ہوگی (لَنْ نَمْسَسَا النَّارَ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُودَةً۔ بقرہ ۹)۔

اس سیاسی تصویر نے ان کے لیے فتنی و فجور اور دنیا پرستی کے دروازے جس طرح چھوٹ کھول دیئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح آخرت کا ماننا، نہ ماننا دونوں یکساں تھا۔ چنانچہ گو وہ لاکھ چلائے رہے کہ ہم قیامت کو مانتے ہیں مگر قرآن نے ان کے اس دعوے کو بے حقیقت قرار دیا، اور ان پر کنایہٴ التزام لگائے بغیر نہ رہا کہ روز جزا کے یقین سے انہیں کوئی سروکار نہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ کے، جس کا مخاطب یہود کی طرف ہے اور جو ان یہودیوں پر رسالت محمدی کی حجت قائم اور تمام کرتی ہے، اس کے ابتدائی پیرا گراف سے مترشح ہوتا ہے، جہاں خدا کے متقی بندوں کی صفات بیان کرتے کرتے قطع کی بات یہ کہی گئی ہے کہ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ (یعنی قرآن سے وہی لوگ ہدایت پاسکتے ہیں جو آخرت کا سچا یقین بھی رکھتے ہوں) اس جملہ میں صریحاً یہودیوں کے ادعائے ایمان پر تعریض کی گئی ہے اور ان کے اُس اُمّ الامراض کی طرف انکی اشارہ دی گئی ہے جو ہدایت قرآنی۔ سکن کی خروجی کا اصل سبب ہے۔ یعنی یہ کہ اگرچہ قرآن سراپا ہدایت ہے مگر یہ ہدایت انہی لوگوں کو ملتی ہے جو خدا پر ایمان رکھتے

ہوں، نماز قائم کرتے ہوں، ماہِ حق میں اپنا مال خرچ کرتے ہوں اور آخر میں یہ کہ ان کے سینوں میں آخرت کا ڈر بھی ہو۔ مگر چونکہ یہ لوگ یقیناً آخرت سے محروم ہو چکے ہیں اس لئے قرآن پر نہ وہ ایمان لائیں گے نہ قرآن کی ہدایت ان کے حق میں ہدایت ہے۔ اسی طرح قرآن جگہ جگہ ان کو جھنجھوڑتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے سینے میرے خوف سے کیوں خالی ہو گئے ہیں، کیوں نہیں آخرت کی بے لاگ باز پرس کی تم فکر کرتے (وَ اتَّقُواْ يَوْمًا لَاَ تَجْزِيْ لَفْسٌ وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُكُمْ شَفَاعَةٌ - بقہ ۱۵) دنیا کے خوف اور لالچ سے تمہارے دل اٹے پڑے ہیں مگر میری دہشت یا میری محبت کا ان میں کوئی گزر نہیں، حالانکہ خوف مجھ سے اور صرف مجھ ہی سے کھانا چاہیے تھا (دِ اَيَّآيَ فَاسْرُ هَبْوْنَ) غرض قرآن نے ان کے خلاف جو کچھ کہا ہے اس کا انداز بیان ایسا ہے جو علانیہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسے ان لوگوں کا دعوائے ایمان بالآخرت تسلیم نہیں، کیونکہ ان کی زندگی کا سارا رویہ اپنے اندر اس زبانی دعوے کی صداقت پر ایک دلیل بھی نہیں رکھتا۔ اس سلسلہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ ان اشیائی نے نہ جانے کب دنیا پرستی کے جوش میں اس نام نہاد عقیدہ آخرت کے خیالی اندیشوں سے بھی اپنا دماغ خالی کر لیا اور اس وقت جو تورات ہمارے سامنے ہے اس میں اس عقیدہ کی کوئی واضح تعلیم سرے سے ملتی ہی نہیں۔

(باقی)